مولانا وحید الدین خانؒ کے سیاسی افکار کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of Maulana Wahiduddin Khan's Political Thoughts

Asif Rasheed
M.Phil. Scholar Islamic Studies, Bahauddin Zakariya University Multan
Email: asifrasheed2323@gmail.com
Aroosa Abbas
Lecturer Islamiat, Govt. Associate College (W) Sanawaan
Email: aroosaabbas786@gmail.com
Dr. Muhammad Arif Mateen
Assistant professor Islamic Research Centre
Bahauddin Zakariya University, Multan
Email: arifmateen@bzu.edu.pk

Abstract
There is a little doubt today as to importance of better understanding of multifaceted and highly complex world of politics and religion. Islam and politics seem to be everywhere today. Numerous interpretations in the efforts to explain the phenomena of political Islam were advanced by various Muslim thinkers and scholars over the centuries including the examination of postcolonial state formation in the Muslim world. Moreover, answer to the question of whether the establishment of an Islamic political order is the primary task of every Muslim or not? Similarly, the question of policy and procedure to regain the glory and honour of Muslims has been crux of the debates in recent decades.
Molana Wahiduddin Khan, born in Azam Garh, India (1925-2021) is one of the most influential Muslim thinkers of the 20th century. Khan's aim was to present Islam in the contemporary idiom including exploring the meaning and scope of Muslim's political engagement. He is well known for his critique of Molana Mowdoodi's political interpretation of Islam. He considered Mododoi's thought as a "Psychology of Reaction". Khan is a pacifist intellectual advocating peaceful coexistence and non-violent struggle with pluralistic approach – a position which can be traced in his over 200 books, a journal "al-Risāla (Eng. version: Spirit of Islam)", and his commentary "Tazkeer-ul-Quran". This humble effort is aimed at presenting an analytical study of his political thought.
Keywords: Wahiduddin Khan, Political Islam, Islamic state, Democracy, law, Accountability, Tazkeerul Quran

تعارف:

مولانا وحید الدین خاں، عام طور پر دانشور طبقہ میں امن پسند مانے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اسلام کے متعلق غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرنا، مسلمانوں میں

مدعو قوم (غیر مسلموں) کی ایذا و تکلیف پر یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی تعلیم کو عام کرنا تھا جو ان کی رائے میں دعوت دین کے لیے ضروری ہیں۔ مولانا وحید الدین خان نے اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے 1970ء کو دہلی میں اسلامک سنٹر قائم کیا۔ جہاں سے انہوں نے اپنی دعوتی اور تصنیفی تحریک کا آغاز کیا۔ مولانا وحید الدین خان نے اپنے مشاہدات کو اپنی ڈائریوں کی شکل میں جمع کیا اور ان میں لکھے ہوئے مضامین کو۔ **الرسالہ**۔ اور دوسری کتب میں شائع کرتے رہے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب کی فکر "ردّ عمل کی نفسیات"(Psychology of Reaction) پر قائم ہے اور یہ ردِ عمل اسلام کے سیاسی تصور، معاصر اسلامی تحریکات اور متنوع مذہبی طبقات کا ہے۔

کچھ لوگ اسلام کا جامع تصور پیش کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ مولانا وحید الدین خاں فرماتے ہیں کہ اسلام میں صرف عقیدہ اور عبادت اور اخلاق شامل نہیں ہیں، بلکہ پولیٹکل سسٹم بھی اس کا لازمی جز ہے۔ پولیٹکل سسٹم کو قائم کئے بغیر اسلام ادھورا رہتا ہے، وہ مکمل نہیں ہوتا۔ یہ بظاہر اسلام کا جامع تصور ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک تخریبی تصور ہے۔"[1]

سیاست دین کا ایک جز ہے کل دین نہیں ہے جس طرح دین میں تجارت کے متعلق احکام ہیں اور کوئی شخص تجارت کو کل دین نہیں کہتا اسی طرح سیاست کے متعلق بھی دین میں احکام ہیں اور سیاست کو بھی کل دین کہنا غلط ہے۔[2]

جدید مسلم مفکرین میں سے بعض کی رائے ہے کہ سیاست زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ایک شعبہ ہے اور دین کا ایک جز ہے اس کو دین سے جدا کرنا درست نہیں ہے۔"[3]

دین میں سیاست کے مقام کے بارے میں مسلم مفکرین کی رائے ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے یعنی دین کی حفاظت اور دنیا کا انتظام بر قرار رکھنے اور نبوت کی جانشینی کے لیے امامت امت پر بالا جماع واجب ہے۔[4]

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک سیاسی اقتدار اسلام کا ایک جز ہے اور یہ اللہ انعام کے طور پر اہل اسلام کو دیتا ہے۔ وہ ایک خدائی انعام ہے جو ایمان اور عمل کے نتیجہ میں مومنین کی جماعت کو دیا جاتا ہے۔ اس غلبہ کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو زمین میں استحکام عطا کیا جائے اور وہ آزادانہ طور پر خدا کی عبادت کریں۔[5]

دین میں سیاست قرآن، سنت اور اجماع تینوں سے ثابت ہے نصب خلیفہ یا اسلامی حکومت کا قیام تمام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے اگر اس کی استطاعت رکھتے ہوں اور اس واجب کی ادائیگی کے لیے استطاعت حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ بات قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ اور اجماع تینوں سے ثابت ہے۔

اسلامی حکومت کو قائم کرنا نماز و روزہ کی طرح ایک اہم دینی فریضہ ہے جو تمام مسلمانوں پر علی الکفایہ لازم ہے۔ استطاعت کے باوجود اس کی ادائیگی سے کوتاہی کرنا معصیت ہے جس طرح حج کی ادائیگی کی استطاعت رکھتے

ہوئے ادا اسے نہ کرنا معصیت ہے۔ یہ شریعت کے فرائض میں سے ایک حصہ ہے جیسے حدود و قصاص، انسداد جرائم و غیرہ کا قیام حکومت پر موقوف ہیں اسی طرح امر بالمعروف یعنی طاقت کے ساتھ شرعی فرائض اور واجبات کی ترویج اور نہی عن المنکر یعنی منکرات اور مناہی کو طاقت سے روکنا اقتدار پر موقوف ہیں بلکہ اسلامی حکومت اسی قسم کے اقتدار کا نام ہے اور یہ اصول ہے کہ واجب کا موقوف علیہ بھی واجب ہی ہوتا ہے۔[6]

مولانا وحید الدین خان فرماتے ہیں کہ سیاسی اقتدار اسلام کا ایک جز ہے اور یہ اللہ انعام کے طور پر اہل اسلام کو دیتا ہے جیسے سورہ النور میں ہے:

" وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ "[7]

" اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے جو مومن ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں کہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم اور پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ "

یہاں جس غلبہ کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا تعلق اولاً رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور اصحاب رسولؐ سے ہے۔ مگر ایک لحاظ سے اس کا تعلق پوری امت سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلبہ اور اقتدار اہل ایمان کے عمل کا نشان نہیں۔ وہ ایک خدائی انعام ہے جو ایمان اور عمل کے نتیجہ میں مومنین کی جماعت کو دیا جاتا ہے۔ اس غلبہ کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو زمین میں استحکام عطا کیا جائے۔ ان کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ دشمنانِ حق کے اندیشوں سے مامون ہو کر رہیں۔ وہ آزادانہ طور پر خدا کی عبادت کریں اور صرف ایک خدا کے بندے بن کر زندگی گزاریں۔ اہل ایمان کے غلبہ کی یہ حالت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ خدا کے شکر کرنے والے بنے رہیں گے اور تقویٰ کی کیفیت کو نہ کھوئیں گے۔[8]

خلیفہ کے معنی عربی زبان میں جانشین یا بعد کو آنے والے کے ہیں۔ استخلاف یا خلیفہ بنانا یہ ہے کہ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ پر علمی اور سیاسی استحکام عطا کیا جائے۔ غلبہ دراصل خدائی امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ خدا ایک کے بعد ایک ہر قوم کو زمین میں غلبہ دیتا ہے اور اس طرح اس کو جانچتا ہے۔ اہل ایمان کی جماعت کے لئے یہ غلبہ امتحان کے ساتھ ایک انعام بھی ہے۔[9]

یہ انعام اس وقت ملتا ہے جب اہل ایمان کی ایک قابل لحاظ جماعت اپنے اوپر اساساتِ دین کو قائم کر لے تو اس کے بعد ہی شرائع دین کی اقامت کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، اصل دین پر خود قائم ہونا گویا اپنی پیٹھ کو کوڑے کے لیے پیش کرنا ہے اور جو لوگ خود اپنی پیٹھ کو کوڑوں کے لیے پیش کر دیں تو پھر ان کو دوسروں کی پیٹھ پر کوڑے

مارنے کا سیاسی اجازت نامہ مل جاتا ہے اور خود سپردگی کی کیفیت کے بغیر لوگوں کو کوڑے مارنا زمین میں فساد برپا کرنے کا باعث ہوتا ہے، اس غلط تعبیر کی وجہ سے جو چیز اہم تھی وہ لوگوں کے لیے غیر اہم قرار پائی اور جو چیز اللہ کے ہاں غیر اہم تھی وہ لوگوں کے لیے اہم ہو گئی۔[10]

خلاصہ یہ کہ دین اور سیاست کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے، اور کسی بھی ضمن میں سیاست کو اسلام سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور اگر کہیں ایسے ہو کہ سیاست اور اسلامی تعلیمات کو الگ کیا جائے تو ایسے غیر منصفانہ قانون اور قیادت کی بنیاد پڑے گی جس سے نسلِ انسانی کی تباہی اور بربادی کا راستہ کھل جائے گا۔ انسانی فلاح و کامیابی کی کنجی اسلامی تعلیمات میں ہی پوشیدہ ہے۔

قیادت کے معیارات:

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلیت دو طرح کی ہوتی ہے، جیسے قرآن میں ہے

"يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى۔"[11]

"اے داوٗد میں تجھ کو زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں پس تو لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش کی پیروی نہ کر۔"

اس آیت میں حاکم کی اہلیت کی لازمی صفات بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ وہ ذاتی تعصبات اور خواہشات سے اوپر اٹھ گیا ہو اور دوسری یہ کہ وہ ہر حال میں حق اور عدل پر فیصلہ کرے خواہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف ہو۔ جن میں یہ دو شرطیں پیدا ہو جائیں وہ خود بخود حکومت کا مستحق ہو جاتا ہے اور ان کے بغیر کسی کو بھی حکومت نہیں مل سکتی اور اگر مل بھی جائے تو وہ زیادہ دیر ان کے پاس رہنے والی نہیں ہے۔

قرآن میں اقامت دین اور اقامت حکومت دو الگ الگ چیزیں ہیں اقامت دین سے مراد آدمی کی انفرادی پیروی ہے اور اقامتِ حکومت سے مراد قوانینِ اسلامی کا اجتماعی نفاذ ہے۔ اسی طرح برائی کا سرچشمہ کوئی حکمران نہیں بلکہ برائی کا سرچشمہ اپنا نفس ہوتا ہے اور جب تک نفس کی اصلاح نہ ہو تو نہ انفرادی زندگی میں اصلاح ہوتی ہے اور نہ معاشرہ میں اصلاح ہو سکتی ہے۔[12]

اقتدار خدا تعالیٰ کی امانت:

اسلام کے اصول حکمرانی کا اولین بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ حاکمیت صرف اللہ تعالی کی ہے، اور اہل ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ اس کو لازماً اس قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیے جس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ قرآن مجید میں اس قاعدے کو جن آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر آیات ذیل اس معاملے میں بالکل واضح ہیں:

"وَ لۡیَحۡکُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِیۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِیۡهِ ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ۔"[13]

"اور چاہیے کہ انجیل والے اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے، اور جو شخص اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو پھر وہی لوگ نافرمان ہیں۔"

اللہ کی کتاب بندوں کے حق میں اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے زندگی کے معاملات میں اسی کی ہدایت پر چلا جائے اور باہمی نزاعات میں اس کے احکام کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ خدا کی کتاب کو اگر حاکمانہ حیثیت نہ دی جائے بلکہ اپنے معاملات و نزاعات کو اپنی دنیوی مصلحتوں کے تابع رکھا جائے تو یہ خدا کی کتاب سے انکار کے ہم معنی ہوگا۔ معاملات کا فیصلہ اللہ کی کتاب کے مطابق نہ کریں بلکہ خواہشوں کی شریعت پر کریں وہ اللہ کی نظر میں کافر اور ظالم اور فاسق ہیں۔[14]

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

"امتِ محمد یہ اللہ کے فیصلے کے مطابق دنیا میں آئی ہے اور یہ "ایکٹر" کی حیثیت سے نہیں بلکہ "فیکٹر" کی حیثیت سے اس دنیا میں زندگی گزارے گی اور یہ اس امت کی ذمہ داری ہے اور اس نے دنیا کے سامنے ایسا نمونہ پیش کرنا ہے کہ حکمرانی اللہ کے لیے ہے اور حکمرانی شریعتِ اسلامی کی ہے اور انسانیت کی خیر خواہی کے لئے اور آخرت کی فلاح کے لئے ہے اور جس میں قربانی و ایثار کا جذبہ ہو۔"[15]

ریاست کے متعلق اہلِ ایمان کا مؤقف ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اس نے آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں حاکم بنا کر بھیجا اور باقی لوگ جو پیدا ہوئے وہ اس کے تابع اور محکوم تھے یعنی انسانوں پر کبھی ایسا زمانہ نہیں گزرا جب ان کی ریاست نہ ہو اور وہ لا قانونیت کی زندگی گزار رہے ہوں اور یہ نظریہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کا بھی ہے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کا اور مسلمانوں کا اختلاف یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں حکمران اللہ کی طرف سے بنتا ہے لہذا کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کو ہٹائیں اور وہ کہتے ہیں کہ جابر و ظالم حکمران بھی اللہ کی طرف سے بنتا ہے لہذا اس کے خلاف بھی بغاوت کرنا جائز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے اس کو اللہ نے کسی گناہ کی سزا کی وجہ سے مسلط کیا ہو اور چونکہ وہ اللہ کی مشیت ہے لہذ اللہ کی مشیت کے خلاف کام کرنا درست نہیں بلکہ اس کے ہر حکم کو ماننا لازم ہے اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا درست نہیں ہے۔

امانتیں اہل لوگوں تک پہنچانے کا حکم:

یہ قانونی صفات جن کے لحاظ سے ہر شخص امارت اور رکنیتِ شوریٰ کا اہل ہو سکتا ہے۔ مگر اس طرح کے بے شمار قانونی اہل اشخاص میں سے کن لوگوں کو ہمیں ان مناصب کے لئے چننا چاہئے اور کن کو نہیں چننا چاہئے۔ اس سوال کا واضح جواب ہمیں قرآن اور حدیث میں یہ ملتا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یَأمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا۔"[16]

"اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔"

اس آیت میں مولانا قیادت کی اہم خصوصیت بیان کرتے ہیں کہ ہر ذمہ داری ایک امانت ہے اور اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب کسی سے معاملہ پڑے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ کرے جو انصاف کا تقاضا ہو۔ اگرچہ بظاہر اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے خلاف نظر آئے تب بھی اس کو انصاف اور سچائی ہی کے طریقے پر قائم رہنا ہے۔ کیوں کہ بہتری اس میں ہے۔ نہ کہ اس میں جو ہمارے نفس کو پسند ہو۔ اگر حکومتی نظام کے مواقع ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ باقاعدہ اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اگر حکومت کے مواقع نہ ہوں تو اپنے اندر کے قابل اعتماد افراد کو اپنا سربراہ بنالیں۔[17]

اسلام ابتداء ہی میں اس اصول کا حامی ہے کہ فی الواقع اور عملاً سیاسی حکومت کی کفیل وامین ملت اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فرد واحد، ہاں جو عمل انتخاب کنندگان اس معاملہ میں کرتے ہیں اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ آزادانہ عملِ انتخاب سے اس سیاسی حکومت کو ایک ایسی مختصر و معتبر شخصیت میں ودیعت کر دیتے ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ یوں کہو کہ تمام ملت کا خمیرِ اجتماعی اس ایک فرد یا شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقتاً اور صحیح معنوں میں فرد تمام کی تمام قوم کا نمائندہ کہلا سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اقتدار کی کرسی پر قیادت میں کوئی بھی ہو، وہ حقیقتاً اس کا اہل صرف اس وقت ہوتا ہے جب وہ اقتدار کو اس خدا کی امانت سمجھ کر استعمال کرے اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کی ہی کوششیں کرے۔ لہٰذا زمین میں اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر استعمال کرنا ہر اہلِ قیادت کا اوّلین فریضہ ہے۔

مساوات بین المسلمین:

اسلامی قیادت کا فرض ہے کہ تمام مسلمانوں کے حقوق بلالحاظِ رنگ ونسل وزبان ووطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد، گروہ، طبقے یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلے میں برتر قرار پاسکتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔"[18]

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ کوئی سفید ہے اور کوئی کالا۔ کوئی ایک نسل سے ہے اور کوئی دوسری نسل سے کوئی ایک جغرافیہ سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی دوسرے جغرافیہ سے۔ یہ تمام فرق صرف تعارف کے لئے ہیں نہ کہ امتیاز کے لئے۔ اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس قسم کے فرق کی بنا پر ایک دوسرے کے درمیان فرق کرنے لگتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق اور تعصب وجود میں آتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ انسان اپنے آغاز کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون اللہ سے ڈرنے والا ہے اور کون اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ اور اس کا بھی صحیح علم صرف خدا کو ہے نہ کہ کسی انسان کو۔[19]

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

نبی ﷺ کے بعد ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی قرآنی تعلیمات اور شرعی احکام اور اسلام کے اصول وضوابط کی حفاظت

کی اور ان پر عمل کر کے دکھایا اور ان اصولوں اور احکام کو ہر امیر اور غیر یب، کمزور اور طاقتور پر بلا تفریق نافذ کیا جو رہتی دنیا کے لیے نمونہ ہے۔[20]

اس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا، اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ اللہ تعالی نے انسانوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور قبیلوں اور قوموں میں اس لئے تقسیم کیا تا کہ ایک دوسرے کی پہچان کر سکیں۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اسلامی خلافت:

اسلام میں کچھ چیزیں مقصد ہیں اور کچھ چیزوں کی حیثیت ذمہ داری کی ہے۔ مثلا اللہ کا شکر، ایک مقصدی نوعیت کی چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر آدمی سے مقصد کے درجہ میں مطلوب ہے۔ ہر آدمی کو لازمی طور پر شکر گزار بننا ہے۔ اس کے برعکس مال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مالی احکام اس وقت شروع ہوتے ہیں جب کہ آدمی مال دار ہو چکا ہو۔ جو شخص مال دار نہ ہو اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ضرور اپنے آپ کو مالدار بنائے تا کہ مال کے بارے میں جو اسلامی احکام ہیں ان کی تعمیل کرے۔[21]

یہی وجہ ہے کہ دونوں کے لیے قرآن میں ایک دوسرے سے مختلف الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ شکر کے لیے قرآن میں یہ لفظ ہے کہ

"بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۔"[22]

"لہذا اس کی بجائے تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور شکر گزار لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔"

جب کہ مال کے لیے یہ نہیں فرمایا کہ مال دار بنو۔ بلکہ یہاں اس قسم کے الفاظ ہیں:

"وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔"[23]

"جو کچھ ہم نے ان کو دیا وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

یعنی پہلے معاملہ میں فرمایا کہ شکر گزار بنو اور دوسرے معاملہ میں فرمایا کہ ہم نے ان کو جو مال دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ گویا شکر گزار تو آدمی کو ہر حال میں بننا ہے، جب کہ مال کے احکام کی تعمیل اس وقت کرنی ہے جب کہ اللہ تعالی کی طرف سے اس کو مال دے دیا گیا ہو۔

سیاست و حکومت کی حیثیت بھی اسلام میں مقصد کی نہیں بلکہ ذمہ داری کی ہے۔ یعنی سیاست و حکومت وہ چیز نہیں کہ ہر آدمی اس کو اپنا نشانہ بنا کر اس کے لیے جد وجہد کرے۔ یہ اللہ تعالی کا عطیہ ہے۔ اللہ تعالی خود اپنی مصلحتوں کے تحت بھی کسی کو زمین میں با اقتدار بنا دیتا ہے اور جب کسی شخص یا قوم کو یہ عطیہ ملے تو اس وقت اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اقتدار کو ان احکام کے مطابق استعمال کرے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔[24]

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سیاست و حکومت کے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ اس سے مختلف ہیں جو مقصدی نوعیت کے احکام کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً عبادت کے لیے قرآن میں یہ الفاظ ہیں:

"وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔"[25]

"اپنے رب کی عبادت کرو موت کے آنے تک۔"

دوسری طرف سیاست و حکومت کے لیے اس قسم کے الفاظ آئے ہیں:

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔"[26]

"وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔"

حکومت کا ذکر "اگر" کے لفظ کے ساتھ ہے اور عبادت کا ذکر "اگر" کے بغیر ہے۔ دونوں کی نوعیت میں یہ فرق نہ ہوتا تو عبادت کے لیے بھی اس قسم کے الفاظ آتے کہ اگر ہم انہیں مسجد دے دیتے ہیں تو وہ ہماری عبادت کرتے ہیں۔

خلافت ایک خدائی عطیہ:

قرآن کے مطابق، خلافت خدا کا ایک عطیہ ہے۔ قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ کہو:

"قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔"[27]

"تو کہہ اے اللہ، بادشاہی کے مالک! جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، جسے تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے تو چاہے ذلیل کرتا ہے، سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

خلافت و حکومت جس کو بھی ملتی ہے خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ خلیفہ بننے کا مطلب زمین میں تمکن واقتدار کا ملنا ہے۔ تمکن واقتدار سراسر خدا کا عطیہ ہے اور وہ عملاً خدا ہی کا عطیہ ہو سکتا ہے۔ تمکین واقتدار کسی کو خالی جزیرہ میں نہیں ملتا۔ یہ مختلف قوموں اور گروہوں کے بالمقابل ایک چیز کو پانے کا نام ہے۔

انسان کی قوت اس سے بہت کم ہے کہ وہ دوسروں کو بے دخل کر کے خود اقتدار پر قبضہ کر سکے۔ تمکن واقتدار کے حصول کے لیے اتنے زیادہ اسباب کی بیک وقت یکجائی درکار ہے کہ وہ تنہا کسی شخص یا قوم کے بس میں نہیں۔ یہ دراصل خدا ہے جو ایسے اسباب پیدا کرتا ہے جو ایک قوم کو تمکن واقتدار کے مقام سے ہٹائیں اور اس کی جگہ دوسری قوم کو تمکن واقتدار کا مقام عطا کریں۔[28]

کسی کو خلافت و حکومت دینے کا یہ فیصلہ خدا کی مختلف مصلحتوں کے تحت ہوتا ہے۔ قرآن میں ان کی بابت اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً اس سلسلہ میں ایک مصلحت امتحان ہے۔ یعنی ایک قوم کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو اختیار دینا تاکہ خدا دیکھے کہ وہ کس طرح عمل کرتی ہے:

"ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔"[29]

"پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تم کو جانشین بنایا ہے تاکہ یہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔"

دوسری مصلحت یہ ہے کہ کسی قوم کی صالحیت کی بنا پر اللہ تعالی اس کے ساتھ احسان کا فیصلہ کرے اور اس بنا پر اس کو زمین کا اقتدار دے دے۔

"وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۔"[30]

"اور ہم یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو زمین میں دبا کر رکھا گیا ہے ان پر احسان کریں ان کو پیشوا بنائیں، انہی کو (ملک ومال کا) وارث بنادیں۔"

اسی طرح ایک مصلحت یہ ہے کہ زمین کو فساد سے بچانے کے لیے اللہ تعالی ایسا کرے کہ وہ ایک قوم کے ذریعہ دوسری قوم کو میدان عمل سے ہٹادے:

"وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔"[31]

"اگر اللہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرے تو زمین میں فساد پھیل جائے۔"

خلافت کے فرائض

خلیفہ کے فرائض کیا ہیں، اس کے بارے میں قرآن کی حسب ذیل آیت واضح رہنمائی کرتی ہے:

"یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ۔"[32]

"اے داوًد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکادے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔"

اس آیت میں تین باتیں کی گئی ہیں--------انصاف کے مطابق فیصلہ کرنا، خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا، اور حساب کے دن سے ڈرتے رہنا۔

مختصر لفظوں میں یہی وہ معیار ہے جس پر جانچ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون شخص صحیح اسلامی خلیفہ ہے اور کون شخص صحیح اسلامی خلیفہ نہیں۔ صحیح اسلامی خلیفہ وہ ہے جس کے دل میں سے ڈر سمایا ہوا ہو کہ اس کو اپنے ہر قول اور فعل کا حساب خدا کو دینا ہے۔ ایسا شخص اپنی رائے اور خواہش پر نہیں چلے گا بلکہ ہر معاملہ میں وہ خدا کی مرضی کو جاننا چاہے گا اور جیسے ہی اس کو خدا کی ثابت شدہ مرضی معلوم ہو گی وہ فوراً اس کو پکڑ لے گا کیوں کہ اس کا ذہن یہ کہے گا کہ اس کو اختیار کر کے میں آخرت میں اللہ کی پکڑ سے بچ سکتا ہوں۔[33] یہی چیز ہے جو کسی حکمران کو خلیفہ حق بناتی ہے۔ اس کا ہر فیصلہ انصاف کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کا ہر اقدام وہ صحیح اقدام ہوتا ہے جو اللہ تعالی کو مطلوب ہے۔

حضرت عمر فاروق کا ایک واقعہ خلافت کی نوعیت کو بخوبی طور پر واضح کرتا ہے:

"عن عمر بن الخطاب انه سأل طليعة و الزبير و كعباً و سلمان ما الخليفة من الملك فقال طلحة و الزبير ماندري فقال سلمان: الخليفة الذي يعدل في الرعية ويقسم بينهم بالسوية ويشفق عليهم شفقة الرجل على اهله، ويقضى بكتاب الله، فقال كعب ما كنت احسب ان في المجلس احدا يعرف الخليفة من الملك غيرى۔"[34]

"حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بار طلحہؓ اور زبیرؓ اور کعبؓ اور سلمان رضی اللہ عنہم سے سوال کیا کہ بادشاہ کے مقابلہ میں خلیفہ کون ہے۔ طلحہؓ اور زبیرؓ نے کہا کہ ہم کو نہیں معلوم۔ حضرت سلمانؓ نے کہا کہ خلیفہ وہ ہے جو رعایا کے اندر انصاف کرے اور جو ان کے درمیان برابری کے ساتھ تقسیم کرے اور جو ان پر اس طرح مہربان ہو جس طرح آدمی اپنے گھر والوں پر مہربان ہوتا ہے۔ اور جو خدا کی کتاب سے فیصلہ کرے۔ حضرت کعبؓ نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس مجلس میں میرے سوا کوئی اور بھی ہے جو بادشاہ کے مقابلہ میں خلیفہ کے فرق کو جانتا ہے۔

صحابی کی یہ تشریح نہایت واضح طور پر بتاتی ہے کہ خدا کے مطلوب خلیفہ کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کیا چیز ہے جس سے حقیقی معنوں میں ایک اسلامی خلیفہ کی پہچان ہوتی ہے۔

بہتر حکومت:

مولانا وحید الدین خان فرماتے ہیں کہ بہتر نظامِ حکومت بنانے کا کام حکومت کی طاقت سے نہیں ہوتا۔ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو حکومت سے باہر رہ کر اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔ اصل یہ ہے کہ بہتر نظامِ حکومت بنانے کا کام بہتر افراد بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ لوگ خالص تعمیری انداز میں ذہن بنانے کے کام میں لگیں۔ وہ تقریر و تحریر اور دوسرے ممکن ذرائع سے ایک ایک شخص کے ذہن میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔[35]

یہ کام خاموش اور پُر امن انداز میں لمبی مدت تک جاری رہے۔ یہ گویا ایک قسم کا تعمیری لاوا پکانا ہے۔ جب افراد کی قابل لحاظ تعداد میں فکر کا لاوا پکتا ہے اور افراد کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے تو اس کے بعد سماج میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔ اور جب سماج کی اصلاح ہو جائے تو اس کے بعد اصلاح یافتہ حکومت بھی لازماً بن کر رہتی ہے۔

افراد میں انقلاب، سماج میں انقلاب لانے کا باعث بنتا ہے اور سماج میں انقلاب حکومت میں انقلاب لے آتا ہے کیوں کہ حکومت جمہوری نظام میں سماج کے اندر سے نکل کر ہی تشکیل پاتی ہے۔ تعمیری لاوا پکانا ایک انتہائی خاموشی کا کام ہے۔ اس میں آدمی کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے مگر اس کو کام کا کریڈٹ بھی نہیں ملتا۔ یہ قوم کا گنبد کھڑا کرنے کی خاطر اس کی بنیاد میں دفن ہو جاتا ہے۔ اس کام کی یہی مشکل نوعیت ہے جس کی بنا پر لوگ اس میدان میں محنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔[36]

دو قسم کے رہنما:

مولانا وحید الدین خان فرماتے ہیں کہ لیڈر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بڑے بڑے مسائل لے کر اٹھتے ہیں۔ جن کے پاس بڑے بڑے نعرے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ہائی پروفائل میں بات کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ

چھپتے ہیں۔ ہر طرف ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ہر مقام پر ان کو استقبال ملتا ہے۔ اس طرح ان کی شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے سے بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ وہ لیڈر ہیں جن کی اپنی شخصیتیں توخوب نمایاں ہو جاتی ہیں مگر عوام کو ان سے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ملتا۔[37]

دوسرا لیڈر وہ ہے جو حقیقی معنوں میں عام انسان کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ ہر آدمی کا درد اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اس کو ایسے کام کی طرف لے کر جاتا ہے جو ایک عام انسان کے لیے تویقیناً بے حد مفید ہوتا ہے مگر وہ کہنے میں کوئی بڑا کام نظر نہیں آتا۔ وہ اخبار کے صفحۂ اول کی سرخی نہیں بنتا۔ اس کی بنیاد پر اس کو تعریفی قصیدے نہیں ملتے۔ ایسے لیڈر کا عمل اس کو ذاتی شہرت تو نہیں دیتا۔ البتہ قوم کے ہر فرد کو وہ اونچا کر دیتا ہے۔ وہ ہر آدمی کو اپنے دائرہ میں ہیرو بناتا ہے۔ وہ ہر آدمی کی شخصیت کو بلند کر دیتا ہے۔

عظمت پرست لوگ اگرچہ پہلی قسم کے لیڈروں ہی کی پوجا کرتے ہیں۔ مگر انسانیت کے حقیقی خیر خواہ صرف دوسری قسم کے لیڈر رہیں۔ وہ اپنے کو چھوٹا کر کے دوسروں کو بڑا بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بنیاد میں دفن کر کے دوسروں کو اونچے مینار کی مانند کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی نفی کر کے دوسروں کے لیے اثبات کے مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔[38]

مولاناوحید الدین خان فرماتے ہیں کہ ملک کے اندر تین قسم کی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے:

(ا) تبدیلی فکر (۲) تبدیلی قانون (۳) تبدیلی قیادت

1. تبدیلی فکر:

تبدیلی فکر سے مراد یہ ہے کہ ہم اس تضاد کو ختم کریں جو ہمارے سماجی منصوبوں اور ہمارے تصورِ زندگی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں ایسا سماج بنانا چاہتے ہیں جہاں تمام باشندے مشترک مقاصد کے لیے مشترک جدوجہد کریں، جس میں کوئی شخص دوسرے کا حق نہ مارے، جس میں آدمی اپنی ذات کے تقاضے پورے کرنے میں قوم کے تقاضے کو نظر انداز نہ کرے۔ ایسا ہی سماج ترقی یافتہ سماج کہا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی سماج میں امن وامان پایا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی سماج میں لوگ خوش حال رہ سکتے ہیں لیکن دوسری طرف ہمارے ملک میں زندگی کا جو نظریہ اختیار کیا گیا ہے وہ خالص مادہ پرستانہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شخصی تمناؤں کی تکمیل کی جگہ یہی دنیا ہے، اس دنیا میں جو شخص زیادہ حاصل کرلے وہ کامیاب ہے اور جو زیادہ حاصل نہ کر سکے وہ ناکام ہے۔ اس نظریے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مال واسباب سمیٹنا چاہے، آدمی کی تمناؤں اور اس کی خواہشوں کی کوئی حد نہیں، اس لیے اس کا سمیٹنے کا جذبہ بھی کہیں ختم نہیں ہوتا۔[39]

2. تبدیلی قانون:

اصلاح کے سلسلے میں دوسرا اقدام یہ ہے کہ قانون کو بدلا جائے۔ قانون انسانی زندگی کا رہنما ہے۔ قانون کسی سماج کی وہ سب سے طاقتور چیز ہے جو زندگی کی شکلوں کو متعین کرتا ہے مگر اس قانون کا تعین نہایت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے نفسیات کا حقیقی علم ہونا ضروری ہے، اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ایک شخص کا کوئی عمل دوسرے شخص پر کیا اثر ڈالتا ہے، اس کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ خارجی دنیا سے ہمارے تعلق کی صحیح ترین نوعیت کیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ کتنی باتوں کو قانون کے دائرہ میں لیا جائے اور کس کو اس سے الگ چھوڑ دیا جائے۔ یہ باتیں انسان معلوم نہیں کر سکتا۔ اس لیے انسان اپنے لیے قانون بھی نہیں بنا سکتا۔[40]

3. تبدیلی قیادت:

تیسری چیز جو ہم ملکی حالات کی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں وہ قیادت کی تبدیلی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ملک کے اختیارات ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں، جو ملک کو صحیح سمت میں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اصلاح کا ہر کام اگرچہ تبلیغ سے شروع ہوتا ہے مگر اپنی تکمیل کے لیے وہ لازمی طور پر طاقت چاہتا ہے۔ اگر مصلحین صرف زبانی تبلیغ پر اکتفا کریں اور سیاسی اختیارات کے استعمال کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیں تو سماجی اصلاح کی کوشش ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہمارے وہ سیاسی لیڈر بڑے ہی نادان تھے جنہوں نے یہ سمجھا تھا کہ ملک میں سیاسی تبدیلی آنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یہاں کے سماجی حالات بھی بدل جائیں گے، اسی طرح وہ لوگ بھی نہایت نادان ہوں گے جو یہ سمجھیں کہ محض تبلیغ اور نصیحت سے کسی ملک کی اجتماعی زندگی میں کوئی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ جس طرح فکری تبدیلی کے بغیر سیاسی تبدیلی بے معنی ہے۔ اسی طرح فکری تبدیلی کی کوشش بھی اس وقت تک کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی جب تک سیاسی طاقت بھی اس کی مددگار نہ ہو جائے۔[41]

یہ قیادت کی تبدیلی اس فکری اور قانونی تبدیلی کا لازمی تقاضا اور اس کی تکمیل ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کسی سماج کے اندر فکری اور قانونی تبدیلی اس ارادے کا اظہار ہے کہ وہ ایک دوسرے نظام کے تحت زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے، اور سماج کے سیاسی ادارے یعنی حکومت کی تبدیلی اس ارادے کو عملی شکل دینا ہے۔ جب ہم سماج کی فکر کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں تو گویا ہم سماج کے اندر ایک ارادہ اُبھارتے ہیں اور جب ہم قیادت کو بدلنا چاہتے ہیں تو گویا ہم بدلے ہوئے ارادے کو خارجی دنیا میں لا رہے ہیں۔[42]

قیادت کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ تمام افراد کی اصلاح کے لیے ان کے اندر جس ذہنیت کا پیدا ہونا ضروری ہے وہی ذہن ان لوگوں کا بھی ہونا چاہیے جو سماج کے اعلیٰ ترین اختیارات پر فائز ہوتے ہیں۔ آخرت کی فکر رکھنے والے اور خدا

کے قانون کو ماننے والے لوگ جب حکومت کا کاروبار سنبھالیں گے اس وقت ممکن ہے کہ لوٹ کھسوٹ نہ ہو، اور ایسے ہی لوگ ایسا کر سکتے ہیں کہ حق دار کو اس کا پورا پورا حق پہنچائیں۔ فکرِ آخرت سے بے پرواہ اور خدائی قانون سے آزاد قیادت کبھی بھی ملکی حالات کو درست نہیں کر سکتی۔ آج ہمارے ملک کا حال یہ ہے کہ جو شخص اعلان کرتا ہے کہ میں خدا سے نہیں ڈرتا اسی کو حکومت میں سب سے بڑا عہدہ مل جاتا ہے، اور جو شخص پارلیمنٹ میں جا کر کہتا ہے کہ خدا کو ہمارے قانونی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے اس کو قانون ساز مجلس کا صدر بنا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کا اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو اس ملک کا انجام وہی ہو سکتا ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ زندگی کا نظریہ ملکی قانون اور سیاسی اقتدار تینوں کو بدلا جائے۔ اگر ملک کے حالات کو بدلنا ہے تو ہمیں یہ تمام تبدیلیاں لانی ہوں گی اور اگر ہم یہ تبدیلیاں نہیں لاتے تو ہرگز ہمارے حالات بدل نہیں سکتے۔

نتیجہ بحث:

مولانا وحید الدین خان کے سیاسی افکار کے تجزیہ میں مندرجہ ذیل نتائج کا حصول عمل میں آیا۔

عصر حاضر کے سیاسی نظاموں کا لازمی جزو "اکثریت کا اصول" جو کہ امور حکمرانی کی انجام دہی میں ہر سطح پر کار فرما ہے اس کو کلی طور پر درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کو الہامی ہدایات کی روشنی میں طے کردہ اصول وضوابط کی پابندی سے مشروط کر دینا ہی انسانی فلاح کا ضامن بن سکتا ہے۔ قانون سازی کے عمل کو مکمل طور پر عوامی خواہشات اور رضامندی کے تابع کر دینا درست نہیں۔ اکثریت کا مفاد ہی ہر حال میں مفادِ عامہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا قانون سازی کے عمل کو الہامی ہدایت کی روشنی میں سر انجام دینا ہی حقیقی معنوں میں مفادِ عامہ کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن جن معاملات میں قرآن وسنت خاموش ہیں وہاں ماہرین کی مدد سے تیار کیے جانے والے قوانین کے نفاذ کے لیے عوامی اکثریت یا عوامی نمائندگان کی اکثریت کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہونا چاہیے۔ سربراہِ ریاست کے تقرر اور انتخاب کے لیے ضروری بنیادی شرائط میں اسلام اور عصر حاضر میں رائج شدہ شرائط وضوابط دونوں کو بنیاد بنایا جانا چاہیے۔ موجودہ دور میں جبکہ حکمرانی ایک پیچیدہ فن بن چکی ہے سربراہِ ریاست کے لیے صرف اعلیٰ اخلاقی و کرداری اوصاف کی موجودگی ہی کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کا اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ضروری فنی مہارت کا حامل ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اسی طرح محض فنی صلاحیتوں کے حامل افراد بھی اچھے حکمران ثابت نہیں ہو سکتے۔ لہذا اعلیٰ اخلاقی و کرداری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ فنی مہارت دونوں کو سربراہِ ریاست کے ضروری اوصاف و شرائط میں شامل کرنا چاہیے۔ اقتدارِ اعلیٰ کی مطلق العنانیت اور لا محدود اختیارات، پھر چاہے اس کا منبع حکمران ہوں یا عوام، دونوں ہی درست نہیں ہیں۔ اختیارات کا لا محدود ہونا مفادِ عامہ کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔

لہذا حکمران ہوں یا عوام اختیارات کے استعمال کے حوالے سے حدود وقیود اور شرائط و ضوابط کا تعین لازمی ہونا چاہیے۔

تجاویز وسفارشات:

1. نبی ﷺ کی سیاسی زندگی کے رہنما اصولوں کو سمجھتے ہوئے حکمران و قائدین نفاذ قانون الٰہی کو ممکن بنائیں۔
2. مخلص، باکردار اور باعمل خالص اسلامی قیادت قوم کے سامنے لائی جائے۔ جن پر انسانی حقوق کا تحفظ لازم ہے۔
3. فرد معاشرے کی بنیادی اکائی ہے جس کی درستگی معاشرے کی اصلاح ہے۔ ہر فرد دوسروں کی اصلاح کرنے کی بجائے اپنی اصلاح کرے تاکہ جب قومی قیادت کے انتخاب کا مرحلہ آئے تو صالح افراد منتخب ہو کر قومی قیادت کا فریضہ سرانجام دیں۔
4. افراد کے ذہنوں میں خدا کا صحیح تصور اور عقیدۂ آخرت کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ تاکہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے افعال میں اللہ تعالی کے سامنے جواب دہی کے تصور کو مردہ نہ ہونے دیں اور صحیح نصب العین اور اعلیٰ وارفع اقدارِ حیات کے حصول کی خاطر کوشاں رہیں۔
5. عصرِ حاضر کے معروضی حالات کے پیشِ نظر سیرت طیبہ کی روشنی میں عسکری و دفاعی لحاظ سے وطن عزیز کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

حوالہ جات

[1]۔ وحید الدین خان، مولانا، صبح کشمیر، نئی دہلی، 2011ء، ص:23

[2]۔ عثمانی، مفتی محمد تقی، اسلام اور سیاست حاضرہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، 1989ء، ص:30

[3]۔ تھانوی، مولانا اشرف علی، مجموعہ افادات، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، 2006ء، ص:17

[4]۔ الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن محمد، الاحکام السلطانیہ، دار الحدیث، القاہرۃ، سن ندارد، ص:14

[5]۔ وحید الدین خان، مولانا، تذکیر القرآن، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، 1985ء، ص:999

[6]۔ محمد اسحق صدیقی، مولانا، اسلام کا سیاسی نظام، مجلس دعوت و تحقیق اسلامی، بنوری ٹاؤن، 1981ء، ص:74-80

[7]۔ القرآن، النور 55:24

[8]۔ وحید الدین خان، مولانا، تذکیر القرآن، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، 1985ء، ص:999

[9]۔ ایضا، ص:1000

[10]۔وحیدالدین خان،مولانا، دین وشریعت،دارالتذکیر لاہور،2005ء،ص:30

[11]۔القرآن،ص26:38

[12]۔وحیدالدین خان،مولانا، دین وشریعت،ص:31

[13]۔القرآن،المائدہ47:5

[14] وحیدالدین خان،مولانا،تذکیر القرآن،مکتبہ الرسالہ،نئی دہلی،سن ندارد،ص:263

[15]۔ندوی،ابوالحسن علی،سید،تحفہ پاکستان، مجلس نشریات اسلام،کراچی،1984ء،ص:43

[16]۔القرآن،النساء58:4

[17] وحیدالدین خان،تذکیر القرآن،ص:198

[18]۔القرآن،الحجرات13:49

[19] وحیدالدین خان،تذکیر القرآن،ص:1411

[20]۔ندوی،ابوالحسن علی،سید،تہذیب تمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، مجلس نشریات اسلام کراچی،1986ء،ص:90-93

[21]۔وحیدالدین خان،مولانا،دین وشریعت،نظام الدین ویسٹ مارکیٹ،نیو دہلی،2002ء،ص:828

[22]۔القرآن،الزمر66:39

[23]۔القرآن،البقرہ03:2

[24]۔وحیدالدین خان،مولانا،دین وشریعت،ص:329

[25]۔القرآن،الحجر99:15

[26]۔القرآن،الحج41:22

[27]۔القرآن، آل عمران26:3

[28]۔وحیدالدین خان،مولانا،دین وشریعت،ص:330

[29]۔القرآن،یونس14:10

[30]۔القرآن،القصص05:28

[31]۔القرآن،البقرہ251:2

[32]۔القرآن،ص26:38

[33]۔وحیدالدین خان،مولانا،دین وشریعت،ص:331

[34]۔ثناءاللہ،پانی پتی،قاضی،تفسیر مظہری،کتب خانہ نعیمیہ دیوبند،سن ندارد،ج:08،ص:173

[35] وحید الدین خان، مولانا، کتاب زندگی، نائس پرنٹنگ پرس، دہلی، 1992ء، ص:98

[36] ایضا، ص:98

[37] ایضا، ص:107

[38] ۔وحید الدین خان، مولانا، کتاب زندگی، ص:108

[39] ۔وحید الدین خان، مولانا، ہندستان آزادی کے بعد، ص:10

[40] ۔وحید الدین خان، مولانا، ہندستان آزادی کے بعد، ص:11

[41] ۔ایضاً، ص:15

[42] ۔ایضاً، ص:16